تعارف وتبصرہ:

متونِ حدیث پر جدید ذہن کے اشکالات

حافظ سعید احمد *

متونِ حدیث پر جدید ذہن کے اشکالات، ڈاکٹر محمد اکرم ورک (مصنف)، الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، کنگنی والا، گوجرانوالہ، سن اشاعت: ۲۰۱۲ء، صفحات: ۵۰۸، قیمت: ۵۰۰ روپے

زمین پر آخری وحی قرآن کے بعد حدیث رسول ﷺ کا جو مقام ہے وہ وہ کسی ذی شعور سے مخفی نہیں اور اسی مقام کے پیشِ نظر ہر دور میں محدثین نے اس کی خدمت میں اپنی زندگیاں کھپا دیں، اور فقہا اور اصولیین نے احکام اخذ کرنے میں اپنی ساری توانائیاں صرف کیں، اور یہی وجہ ہے کہ بالعموم ہر صدی علمِ حدیث کے لیے کسی نہ کسی پہلو سے امتیازی حیثیت رکھتی ہے، اور بالخصوص تیسری صدی کو سنہری دور کہا جاتا ہے کیونکہ اس صدی میں کتب ستہ کے مجموعے وجود میں آئے۔

علمِ حدیث کے آغاز وارتقاء کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی صدیوں ہی میں حدیث کے انکار اور اعتراضات کی تحریک نے جنم لے لیا تھا، لیکن یہ تحریک بدقسمتی سے جہالت پر مبنی تھی اسی وجہ سے سرکاری سرپرستی کے باوجود زیادہ عرصہ نہ چل سکی اور قبل از بلوغت دم توڑ گئی اور اس تحریک کا تذکرہ کتابوں ہی میں رہ گیا۔ پھر جب یورپ نے علمی وفکری میدان میں مسلمانوں کو زچ کرنے کے لیے تحریک کا آغاز کیا تو انہوں نے قرآن، حدیث، تاریخ اسلام اور پیغمبر ﷺ کی ذات کا تنقیدی مطالعہ شروع کیا اور اپنے مطالعے کے حاصلات دنیا کے سامنے پیش کیے تو مسلمان علماء نے ہر دور میں اس کا جواب دیا لیکن مستشرقین نے ہر دور میں اپنے منہج واسلوب میں تو تبدیلی کی لیکن اسلام پر تنقید پر روش برقرار رکھی، عہدِ حاضر میں انہوں نے متونِ حدیث پر تنقیدی کام شروع کیا تاکہ اس ذخیرہ کو مشکوک قرار دیا جاسکے۔ اور علمائے کرام نے ہر دور میں مستشرقین اور منکرین حدیث کے اٹھائے گئے اعتراضات کا جواب دینے کے لیے ہر ممکن کوشش کی اور اس کے نتیجے میں بہترین تجزیاتی لٹریچر منظر عام پر آیا، زیرِ تبصرہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، بنیادی طور پر یہ کتاب معروف دینی اسکالر ڈاکٹر محمد اکرم ورک کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جو ۲۰۰۷ میں انہوں نے جامعہ پنجاب لاہور سے صحاح ستہ کی احادیث پر منکرین حدیث اور مستشرقین کا علمی جائزہ

* پی۔ایچ۔ڈی اسکالر، شیخ زاید اسلامک سینٹر پنجاب یونیورسٹی لاہور، پاکستان۔

کے نام سے مکمل کیا۔ پھر ۲۰۱۲ میں بعض اضافات اور مقالہ کے نام کی تبدیلی کے ساتھ کتاب ھذا کی شکل میں پیش کیا ہے۔

مصنف کتاب کے مقدمے میں زیرِ نظر کتاب کی اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں: مستشرقین اور منکرینِ حدیث کے رد میں لکھے گئے تحریری ادب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث وسنن کی ضرورت واہمیت اور حجیت پر تو بلاشبہ بہت لکھا گیا ہے اور خوب لکھا گیا ہے لیکن جہاں تک متونِ حدیث پر اعتراضات کا تعلق ہے تو اس موضوع پر مربوط اور خالص علمی اور تحقیقی انداز میں کافی کام کی گنجائش ہے، زیرِ نظر کتاب میں اسی ضرورت کو پورا کرنے کی ایک طالب علمانہ کوشش کی گئی ہے (ص ۶۴)

کتاب پر تقریظ پیر محمد امین الحسنات شاہ نے لکھی ہے، پیش لفظ مولانا ابوعمار زاہد الراشدی نے رقم فرمایا ہے۔ کتاب ایک مقدمہ اور چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ اور کتاب کے ابواب مختلف فصول پر مشتمل ہیں۔

کتاب کا مقدمہ فہرستِ عنوانات کے مطابق تین حصوں میں منقسم کیا گیا ہے، ہر عنوان کے تحت موضوع سے متعلق مربوط اور محققانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ پہلا عنوان: دین اسلام میں رسول خدا کا مقام اور منصب، دوسرا عنوان: فتنہ انکارِ سنت کا آغاز وارتقاء، تیسرا عنوان: فتنہ انکارِ سنت کا نیا ظہور۔

باب اول:

ذخیرہ حدیث کی حفاظت واستناد سے متعلق روایات کے نام سے ہے اور یہ دو فصول پر مشتمل ہے، پہلی فصل ذخیرہ حدیث کی کتابت وتدوین سے متعلق روایات پر مشتمل ہے، فصل دوم ذخیرہ حدیث کے استناد سے متعلق روایات کے نام سے لکھا گیا ہے۔

باب دوم:

حفاظت قرآن سے متعلق روایات پر مشتمل ہے

باب سوم:

ظاہری تعارض پر مبنی روایات پر مبنی ہے، اور دو فصول پر مشتمل ہے، پہلی فصل میں باہم متعارض روایات پر بحث کی گئی ہے، دوسری فصل میں قرآن مجید کے ساتھ متعارض روایات زیرِ بحث لائی گئی ہیں

باب چہارم:

میں سیاست وقضا سے متعلق روایات پر اٹھائے گئے اعتراضات کا جائزہ لیا گیا ہے، اور یہ باب بھی دو فصول، فصل اول منکرین ومعاندین کے خلاف اقدامات کی روایات، اور فصل دوم سزائے رجم کی روایات پر مشتمل ہے

باب پنجم:

انبیائے علیہم السلام کی سیرت سے متعلق روایات پر بحث کی گئی ہے، یہ باب تین فصول پر مشتمل ہے، فصل اول: انبیائے سابقین کی سیرت سے متعلق روایات، فصل دوم: رسول اکرم ﷺ کی سیرت سے متعلق روایات، فصل سوم: رسول اللہ ﷺ کی نجی زندگی سے متعلق روایات پر بحث کی گئی ہے،

باب ششم:

عقل عام اور مشاہدہ سے ظاہری تعارض پر مبنی روایات

علامہ زاہد الراشدی نے گیارہ صفحات پر مشتمل کتاب کا پیش لفظ لکھا ہے جس میں انہوں نے قرآن وسنت کے باہمی تعلق کو مدلل انداز سے واضح کیا اور سنت کی اہمیت اور استشراقی طاقتوں کی اسلام کے بارے میں ریشہ دوانیوں کے بارے میں مختصر تحریر کیا ہے، آپ سنت کی اہمیت واضح کرتے ہوئے علامہ جلال الدین سیوطی کے حوالے سے لکھتے ہیں: حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جب حضرت عبداللہ بن عباس کو خوارج کے ساتھ گفتگو کے لیے بھیجا تو اسی خدشے کے پیشِ نظر ان سے فرمایا تھا کہ ان کے پاس جاؤ اور ان سے بحث کرو، لیکن ان کے سامنے قرآن سے استدلال نہ کرنا، اس لیے کہ قرآن کریم کے الفاظ میں مختلف معانی کا احتمال ہوتا ہے، بلکہ ان کے ساتھ سنت کے حوالے سے گفتگو کرنا، حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا کہ میں قرآن کریم کو ان سے زیادہ جاننے والا ہوں یہ ہمارے گھروں میں اترا ہے (یعنی قرآن کریم کے حوالے سے گفتگو میں بھی وہ مجھ پر غالب نہیں آسکتے)۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن قرآن کریم احتمالات کا حامل ہے تم ایک مطلب بیان کرو گے تو وہ دوسرا مطلب نکال لیں گے، تم ان کے ساتھ سنن کی بنیاد پر بحث کرنا، کیونکہ ان سے بھاگنے کی راہ نہیں مل سکے گی (ص:۲۱) آپ تحقیق اور تحقیقی رویے کے بارے میں لکھتے ہیں: ہر مؤرخ اور محقق کا حق ہے کہ روایات کی بنیاد پر اپنی تحقیق کے مطابق کوئی رائے قائم کرے اور اس کا اظہار بھی کرے اس نوعیت کے سینکڑوں مسائل امت کے اہلِ علم میں مختلف فیہ چلے آرہے ہیں اور ان پر بحث وتمحیص کا سلسلہ بھی جاری ہے جبکہ آئندہ بھی قیامت تک ان مباحث کا دروازہ کھلا ہے، البتہ بحث کا یہ پہلو کہ جناب نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی کے بارے میں مغرب کے اعتراضات اور طعن وتشنیع کا جواب دینے کے لیے ہم اپنی ہی روایات اور علمی اثاثے کی اکھاڑ پچھاڑ میں لگ جائیں، بہر حال قابل توجہ ہے اور ہمارے خیال میں ایسے مسائل میں اپنے علمی ذخیرے کے درپے ہونے سے پہلے ہمیں اس بات کا جائزہ لینا چاہیے کہ مغرب کے اعتراضات کی فکری اساس کیا ہے اور اس طعن وتشنیع کی اپنی علمی حیثیت کیا ہے جس کی بنیاد پر اسلام کی تعلیمات یا جناب نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی کو موردِ طعن قرار دیا جارہا ہے۔ اصل ضرورت اس کی

بات ہے کہ مغرب کے اٹھائے ہوئے مطاعن واعتراضات کی علمی حیثیت کا تجزیہ کیا جائے اور ہر مغربی اعتراض کو درست تسلیم کرنے کی بجائے اس کی خامی کو واضح کرنے کی کوشش کی جائے ،مگر ہمارا المیہ یہ ہے کہ علامہ محمد اقبال کے بعد مغربی فلسفہ وثقافت کا اس سطح پر ناقدانہ جائزہ لینے اور کوئی مفکر سامنے نہیں آیا اور اس سے بڑا المیہ یہ ہے کہ خود اقبال کا نام لینے والے اس معاملے میں اقبال کی راہ پر چلنے کی بجائے مغربی فلسفہ وثقافت کی نام نہاد علمی برتری کے سامنے سربسجود دکھائے دے رہے ہیں (ص۲۶) بہر حال یہ نکتہ کہ ہم اپنی ہی روایات اور علمی اثاثے کی اکھاڑ پچھاڑ میں لگ جائیں ،غور طلب ہے کیوں کہ اس سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہماری روایات اور علمی اثاثے کمزور بنیادوں پر کھڑے ہیں؟ خدانخواستہ ایسی بات ہے تو واقعی تحقیق وتفحص کا امر خطرناک نتائج پیش کرنے پر مجبور ہوگا اور اگر بنیاد مضبوط ہے تو یہ اثاثے مزید نکھر کر دنیا کے سامنے آئیں گے اور دین پر مستشرقین کے حملوں کا مؤثر جواب بھی ہوگا۔

کتاب کا مقدمہ فہرست عنوانات کے مطابق تین حصوں میں منقسم ہے ہر عنوان کے تحت موضوع سے متعلق مربوط اور محققانہ انداز میں بحث کی گئی ہے اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ روایتی الزام تراشی یا جذباتی انداز سے بات کرنے کی بجائے کٹر مخالف کے بارے میں بھی اعتدال برمبنی رویہ اختیار کیا گیا ہے جو کہ مصنف کی وسعتِ علمی اور وسعتِ قلبی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

پہلا عنوان دین اسلام میں رسولِ خدا کا مقام اور منصب ہے قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت جامع انداز میں کی گئی ہے، دوسرا عنوان فتنہ انکار سنت کا آغاز وارتقاء ہے اس میں مصنف نے ابتدائی ادوار میں انکارِ حدیث کے دو اہم ترین گروہوں خوارج اور معتزلہ کے بارے میں ابتدائی نوعیت کی معلومات فراہم کی ہیں،مصنف خوارج کے بارے میں لکھتے ہیں:اگرچہ خوارج نے سب سے پہلے حدیث وسنت سے انحراف کیا،لیکن چونکہ یہ انحراف محض جہالت کی بناء پر تھا،اس لیے یہ انحراف انکارِسنت کی کسی منظم تحریک کی صورت اختیار نہ کرسکا۔اس لیے یہ کہنا درست معلوم ہوتا ہے کہ پہلی صدی ہجری تک مسلمانوں کی تقریباً تمام فرقے ہی حدیث وسنت کی حجیت کے قائل تھے، یہاں تک کہ پہلی صدی ہجری کے آخر میں معتزلہ کا ظہور ہوا، جنہوں نے فتنہ انکارِسنت کو ایک منظم تحریک کی شکل دی (ص۴۳) موضوع سے متعلق کتابوں کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے کہ کس طرح محدثین نے ملتِ اسلامیہ کو معتزلہ کے گمراہ کن عقائد سے محفوظ رکھا اور متقدمین کی دو کتابیں ابن قتیبہ کی تاویل مختلف الحدیث اور طحاوی کی شرح مشکل الاثار، بقول مصنف ہمارے موضوع کے قریب تر ہیں ،ان دو کتابوں میں معتزلہ اور دیگر متکلمین کی طرف سے احادیث نبویہ پر وارد ہونے والے اعتراضات کا نہایت عمدگی سے رد کیا ہے۔

تیسرا عنوان فتنہ انکارِ سنت کا نیا ظہور ہے ، یہ عنوان پہلے دو عناوین سے زیادہ وسعت کا حامل ہے اور

مصنف نے اس کو چار حصوں میں تقسیم کر کے بحث کی ہے۔ پہلے حصے میں مستشرقین کے حدیث وسیرت پر مختصر کام اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں کے ہاں وجود میں آنے والے گروہوں کا تذکرہ اور پھر مسلمان اسکالرز کا اس تصور کے رد میں لکھے گئے لٹریچر کی تفصیل دی گئی ہے۔ مصنف لکھتا ہے: مغرب نے سیاسی میدان میں مسلمانوں کو ہزیمت سے دوچار کرنے کے بعد عربی زبان وادب اور اسلامی لٹریچر کے مطالعہ کو خاص اہمیت دی تاہم اسلامی سوسائٹی میں ان کے فکر وفلسفہ کے نفوذ کی رفتار قدرے سست رہی۔ ایک ڈیڑھ صدی کے تجربات کے بعد مستشرقین نے یہ محسوس کیا کہ ان کے طریقہ کار میں بنیادی غلطی تھی جس کی وجہ سے ماضی میں وہ اپنی محنت کے ثمرات سے محروم رہے ہیں۔ ماضی کے نتائج اور تجربات کی روشنی میں مستشرقین نے اپنے طریق کار میں نمایاں تبدیلی کی اور اب ان کا مقصد یہ ٹھہرا کہ مسلمانوں کو بدلنے کی بجائے اصلاح مذہب (Reformation) اور اسلام کی جدید تعبیر کی حوصلہ افزائی کی جائے (ص ۴۷)۔ مصنف مستشرقین کے طریقہ تحقیق کے ضمن میں لکھتے ہیں: مستشرقین نے دینی علوم کی جانچ پرکھ کے لیے آزادی فکر اور عقل کو ایک اہم ذریعہ قرار دیا۔ ان کے ہاں تحقیق کا منطقی (Logical) سائنٹیفک (Scientific) اسلوب اسے قرار دیا جاسکتا ہے جو عقل ومنطق، اعداد وشمار اور معروضیت کے تقاضوں پر پورا اترتا ہو۔ اس کے برعکس اسلامی علمی روایت میں تواتر اور تعامل امت کے علاوہ علوم کی جانچ پرکھ میں اسناد کو مرکزی اہمیت حاصل ہے، جبکہ عقل کی حیثیت معاون اور مددگار کی ہے اس لیے مغرب کے اصول تحقیق اسلام کے علمی ورثہ کی معرفت اور جانچ پرکھ کے لیے ناقابل قبول ہیں۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ مستشرقین کے اسلوب تحقیق اور ان کے فکر وفلسفہ کا تجزیاتی مطالعہ کر کے اس کی کمزوریوں کو عیاں کیا جاتا، لیکن بدقسمتی سے اس دور میں عالم اسلام کسی ایسی ہستی کے وجود سے خالی رہا۔ اس کے برعکس اس دور میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے مغربی فکر وفلسفہ کا تنقیدی جائزہ لینے کی بجائے مغرب کی طرف سے آنے والی ہر چیز کو سراسر عقل کا تقاضا سمجھا اور یہ چاہا کہ اسلام کے عقائد اور اصول وضوابط کی ایسی تشریح اور تعبیر کی جائے جو نام نہاد عقلی تقاضوں کے مطابق ہو چونکہ اسلام کی من مانی تشریح اور تعبیر کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سنت رسول تھی، اس لیے ان لوگوں نے حدیث وسنت کو اپنی شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ مبالغہ آمیز حد تک عقلی پرستی کے اس دور میں کسی بھی چیز کے رد وقبول کے لیے عقل ہی فیصلہ کن کسوٹی اور معیار ٹھہری (ص ۴۸۔۴۷)

دوسرے حصے میں ان تین گروہوں، جن کا حدیث کے ضمن میں متوقف باہم متصادم ہے، کا باہم تذکرہ کیا گیا ہے، پہلے گروہ میں مولوی عبداللہ چکڑالوی اور ان کے متبعین جن پر منکرین حدیث کی اصطلاح صادق آتی ہے، اور دوسرے گروہ میں نظری طور پر حدیث کی حجیت کے کسی حد تک قائل ہیں لیکن عملی طور پر انکار کرنے والے غلام احمد

پرویز شامل ہیں، تیسرے گروہ میں فراہی مکتبہ فکر شامل ہے جو حدیث وسنت کی حجیت کے قائل ہیں تاہم اخبار احاد کو صرف اسی صورت میں قبول کرتے ہیں جب ان کی کوئی اصل قرآن یا سنت متواترہ میں موجود ہو اور عقلی اصولوں سے نہ ٹکراتی ہو۔مصنف نے ان تین گروہوں کے علاوہ امت کے بعض اہلِ علم مثلاً سید ابو الاعلیٰ مودودی، علامہ تمنا عمادی، مولانا شبیر احمد ازہر میرٹھی اور ڈاکٹر غلام جیلانی برق وغیرہ کے بعض اشکالات کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے ۔اور مصنف نے حدیث پر تنقیدی روایت کا تذکرہ بھی کیا کہ مسلمان اہلِ علم (فقہا و محدثین و متکلمین) نے بہت سی ایسی روایات پر تنقیدی سوالات اٹھائے ہیں جو سند کے لحاظ سے بظاہر صحیح ہیں اور امام طحاوی (م:۳۲۱ھ) سے لے کر علامہ انور شاہ کشمیری (م:۱۳۵۲ھ) تک کے اہلِ علم کی فہرست دی ہے (ص ۵۸) اور حدیث کو کس صورت میں رد کیا جائے گا اس بارے میں خطیب بغدادی کی کتاب الفقیہ والمتفقہ کا اقتباس دیا ہے

تیسرے حصے میں مستشرقین اور منکرین کے اعتراضات کی اقسام اور مطالعہ حدیث کے دوران پیش نظر رکھے جانے والے اصولوں کا تذکرہ کیا ہے، حدیث وسنت پر اعتراضات کی دو اقسام ہیں: پہلی قسم کے اعتراضات وہ ہیں جن میں حدیث کی حجیت، اس کی قانونی اور تشریعی حیثیت پر تنقید کی گئی ہے، دوسری قسم کے اعتراضات کا تعلق حدیث کے متون کے ساتھ ہے اور مطالعہ حدیث کے دوران چھ قسم کے اصول پیش نظر رکھنا ضروری ہیں: تمثیل کے انداز میں کی گئی بات بعض کم فہم لوگ لفظی طور پر لیتے ہیں۔موضوع کی تمام روایات کو یکجا کر کے حدیث کے بارے میں رائے قائم کی جائے، روایت کے کسی خاص سبب اور حکمت کو معلوم کیا جائے، جن روایات می تناقض موجود ہے ان اختلافات کو تنوع اور توسع پر محمول کیا جائے، روایت میں موجود حکم کا تعلق کسی خاص طبقے سے ہوتا ہے اس کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے، بعض اوقات کسی راوی کے تسامح کی وجہ سے الفاظ میں کمی بیشی ہوجاتی ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ روایت کے جامع متن کو پیش نظر رکھا جائے۔

چوتھے حصے میں زیر بحث موضوع کے بارے میں علمی کاوشوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور بقول مصنف مذکورہ تمام کتب کسی مخصوص صاحب قلم یا اس کی کسی کتاب کے جواب میں لکھی گئی ہے (ص ۴۸) مصنف لکھتے ہیں: منکرین حدیث اور اہلِ تجدد نے صحاح ستہ کی جن روایات پر تنقید کی ہے، ان میں سے بعض روایات کمزور ہیں اور محدثین پہلے سے ان کے ضعف کو واضح کر چکے ہیں۔ایسی روایات چونکہ ناقابل استدلال ہیں، اس لیے ہم نے بھی ان سے کوئی تعرض نہیں کیا، تاہم زیرِ نظر کتاب میں، منکرین حدیث اور اہل تجدد نے جن صحیح روایات پر تنقید کی ہے، صرف انہی روایات پر اعتراضات واشکالات کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

پہلا باب ذخیرہ حدیث کی حفاظت واستناد سے متعلق روایات کے نام سے ہے اور یہ دو فصول پر مشتمل

ہے، پہلی فصل میں ذخیرہ حدیث کی کتابت وتدوین سے متعلق روایات کا جائزہ لیا گیا ہے، اور یہ تین مباحث پر مشتمل ہے۔ فصل کے آغاز میں موضوع سے متعلق دو اعتراضات لکھ دیے گئے ہیں ایک یہ کہ اگر حدیث بھی وحی ہے تو پھر ان احادیث میں اس نوعیت کا تضاد کیوں ہے کہ کہیں تو حدیث لکھنے کی سخت ممانعت آئی ہے اور کہیں لکھنے کا حکم ہے ؟ دوسرا یہ کہ روایات میں اس تعارض کی وجہ سے صحابہ کرام کا رجحان چونکہ حدیث کی عدم کتابت کی طرف تھا، اس لیے قرنِ اول میں احادیث کو تحریری صورت میں محفوظ نہ کیا جاسکا جس کے نتیجے میں اکثر احادیث ضائع ہوگئیں (ص ۷۲)۔ پہلی فصل کتابتِ حدیث کے موضوع پر مشتمل ہے پہلا مباحث کتابت حدیث کی ممانعت کی روایات پر مشتمل ہے اس سے متعلق مشہور روایات چار صحابہ کرامؓ یعنی حضرت ابو سعید خدریؓ (۷۴ھ)، حضرت ابوھریرہؓ (۵۸) حضرت زید بن ثابتؓ (م ۴۴ھ) اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ (م: ۷۳ھ) سے مروی ہیں، مصنف نے ان چاروں روایات پر علماء ومحدثین کے کلام کی روشنی میں جائزہ لیا ہے کہ ان روایات میں بنیادی نوعیت کی کمزوری کیا ہے اور اس موضوع پر ان روایات کو اصل کی حیثیت کیوں نہیں حاصل ہے۔ دوسرا مباحث کتابتِ حدیث کی اجازت کی روایات سے متعلق ہے۔ اس موضوع پر معروف روایات درج کی گئی ہیں۔ تیسرے مباحث میں محدثین کے مؤقف کو واضح کیا گیا ہے، روایات کے ظاہری تعارض کو دور کرنے کے لیے مصنف محدثین کے مؤقف کے بارے میں لکھتا ہے: محدثین کے ہاں معروف اصول یہ ہے کہ ظاہری تعارض کو دور کرنے کی صورت میں جمع وتطبیق، ایسا ممکن نہ ہو تو ناسخ ومنسوخ، ایسا ممکن نہ ہو تو راجح ومرجوح کا اعتبار کرتے ہیں، ورنہ پھر توقف کرتے ہیں۔ مصنف نے بحث کو ان الفاظ میں سمیٹا ہے: مذکورہ پوری بحث اور دلائل کا حاصل یہ ہے کہ وہ روایات جن میں کتابت سے منع کیا گیا ہے اگرچہ اصولِ روایت اور سند کے لحاظ سے ان میں سے بعض صحیح ہیں، تاہم موضوع کے تفصیلی مطالعہ سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آتی ہے کہ یہ احادیث ایک خاص عبوری دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان احادیث کا سیاق وسباق، تاریخی پسِ منظر اور دیگر داخلی شواہد ہمارے اس مؤقف کی تائید کرتے ہیں، جبکہ صحابہ کرامؓ کی کثیر تعداد کا کتابتِ حدیث کی طرف عملی رجحان بھی ان احادیث کے درست محل کو متعین کرنے میں بہت مددگار ہے (ص ۸۸)

فصل کے آغاز میں مذکور دو اعتراضات کا جواب اس فصل کے آخر میں درج کیا گیا ہے عہدِ رسالت مآب ﷺ میں، یعنی قرنِ اول میں کتابتِ حدیث کی کیا نوعیت ہوا کرتی تھی، اس ضمن میں ڈاکٹر محمد حمیداللہ (م: ۲۰۰۱ء) کی تحقیقات اور ڈاکٹر محمد مصطفیٰ الاعظمی کی پی ایچ ڈی کے مقالے Studies in Early Hadith Literature) کا بطورِ خاص ذکر کیا گیا ہے۔

فصل دوم ذخیرہ حدیث کے استناد سے متعلق روایات کے نام سے لکھا گیا ہے۔ حدیث کی استنادی

حیثیت کسی بھی حدیث کے طالب علم سے ڈھکی چھپی نہیں، یہی وجہ ہے کہ مستشرقین اور منکرین حدیث نے اس کی استنادی حیثیت کو چیلنج کرنے کے مختلف حربے اختیار کیے، اسی فصل میں مصنف نے مسکت جواب دینے کی کوشش کی۔ انکارِ حدیث کی ایک صورت یہ بھی ہے براہِ راست انکار کرنے کی بجائے ان شخصیات کو مطعون کیا جائے جن پر ذخیرہ حدیث کا انحصار ہے، جیسا کہ حدیث کے ضمن میں حضرت ابوھریرہؓ اور ابن شہاب زہری کا انتخاب کیا گیا ہے، اس فصل میں مصنف نے پانچ عنوانات کا انتخاب کیا ہے اور ہر عنوان سوائے دو کے ذیل میں توضیحات کے عنوان سے بحث کی گئی ہے۔ پہلا عنوان میں حضرت ابوھریرہؓ سے مروی حدیث پر مستشرقین اور منکرین کے الزام کا جائزہ لیا گیا ہے اور تخریج کے ذریعے یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ یہ روایت پر الزام ہی سرے سے غلط ہے۔ دوسرے عنوان کے تحت ابن شہاب زہری پر یہ الزام کہ وہ بنوامیہ کے لیے دینی و سیاسی مقاصد کے لیے حدیثیں وضع کیا کرتے تھے، شد رحال والی حدیث اور قبۃ الصخرۃ کی تعمیر کے موضوع میں واضح کر دیا کہ گولڈ زیہر کے اعتراض کی بنیاد مؤرخ یعقوبی کی بیان کردہ روایت ہے اور یہ پوری تاریخ میں واحد مؤرخ ہے جس نے یہ روایت گھڑی ہے۔ تیسرے عنوان کو ذخیرہ حدیث میں اہلِ کتاب کی روایت؟ کے نام سے معنون کیا گیا ہے۔ اس میں مستشرقین نے یہ الزام عائد کرنے کی کوشش کی کہ ذخیرہ حدیث میں اہلِ کتاب کی روایات راہ پا گئی ہیں، مصنف نے اہلِ کتاب کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کی نوعیت اور ان کی بیان کردہ روایات کی وضاحت توضیحات کے نام سے کی ہے اور اس بحث کی بنیاد اس اصول کے بیان پر رکھی کہ تمام الہامی ادیان کی بنیادی تعلیمات ایک ہی ہیں (ص ۱۰۸) چوتھا عنوان بنوعباس کے استحقاقِ خلافت کے لیے وضع حدیث کا الزام کے نام سے ہے اس میں بخاری و مسلم کی ایک روایت پر بحث کی گئی ہے کہ کس طرح منکرین حدیث الفاظ پر غور و تدبر کی نعمت سے محروم ہیں، پانچویں عنوان کے تحت صحابہ کی تنقیص کے لیے وضع روایت کے الزام کا جائزہ لیا گیا ہے اور دلائل و قرائن سے واضح کیا ہے کہ اس روایت میں لفظ اصحابی سے مراد تمام صحابہ کرام ہیں یا چند لوگ۔

باب دوم حفاظت قرآن سے متعلق روایات کے نام سے ہے۔ باب دوم کے موضوعات کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، پہلے حصے میں قرآن مجید میں آیت رجم، آیت رضاعت، لوکان لابن آدم وادیان، سورۃ اللیل میں تحریف کے موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔ یہ وہ آیات ہیں جو منسوخ ہو چکی ہیں لیکن مستشرقین اور منکرین نے قرآن میں تحریف کا الزام روایات کے سر تھوپنے کے لیے استعمال کیا ہے، مصنف لکھتا ہے: نسخ فی القرآن کا قانون مسلمانوں کے ہاں مسلم ہے، نسخ قرآنیات اور اسلامیات کی ایک مستقل اصطلاح اور معرکۃ الاراء موضوع ہے جس پر علماء نے بڑی طویل بحثیں کی ہیں۔ مستشرقین نے نسخ فی القرآن کو قرآن میں ترمیم و اضافہ اور ارتقاء کے ثبوت میں

پیش کیا ہے جبکہ منکرین حدیث نے نسخ کو روایت پرست محدثین کی اختراع قرار دیا ہے (ص ۱۵۶۔۱۵۷)
دوسرا حصہ سبعۃ احرف اور متن قرآن کی محفوظیت کے مبحث پر مبنی ہے مصنف اس کا خلاصہ ان الفاظ میں کرتا ہے: سبعۃ احرف کی پوری بحث پر غور وفکر کے بعد یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ یہ سارا اختلاف محض نظری ہے اور عملی اعتبار سے قرآن کریم کی حقانیت وصداقت اور اس کے محفوظ رہنے پر اس اختلاف کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوا۔ اختلافِ قرات کی روایات کے تنقیدی مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ قرآنی قرات کا مدار سینہ بہ سینہ منتقلی پر ہے نہ کہ کتابت پر۔ ابتدائی دور میں قرآن مجید پر اعراب اور نقطوں کے نہ ہونے سے اس اختلاف کا کوئی تعلق نہیں ہے، جیسا کہ مستشرقین اپنے قارئین کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ مختلف قراتوں کے وجود کے باوجود عملی طور پر ساری امت کا ہمیشہ ایک ہی قرات پر اتفاق رہا ہے۔ دوسری قراتیں تفسیر اور حدیث کی کتابوں میں نقل ہوتی چلی آرہی ہیں جن سے آیات کے مفہوم میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور ان سے علمائے کرام مسائل کا استنباط کرتے ہیں (ص ۱۷۴۔۱۷۵)

تیسرے حصے میں عہدِ صدیقی میں جمع وتدوین قرآن کی روایت پر بحث کی گئی ہے، روایات کے الفاظ بتلا رہے ہیں کہ جنگ یمامہ میں حفاظ قرآن کی بڑی تعداد شہید ہوگئی تھی لیکن مستشرقین نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ صرف دو قرأ شہید ہوئے تاکہ عہدِ صدیقی میں جمع قرآن کو افسانہ قرار دیا جاسکے۔ مصنف نے ابن کثیر کے حوالے سے شہداء جنگ یمامہ کی فہرست پیش کر کے اصل حقیقت کو واضح کر دیا (ص: ۱۷۸۔۱۷۹)

باب سوم ظاہری تعارض پر مبنی روایات کے جائزے پر مشتمل ہے۔اس باب کو مصنف نے دو فصول میں تقسیم کیا ہے۔ فصل اول باہم متعارض روایات پر مبنی ہے، اس فصل میں مصنف نے زیادہ تر ان روایات کا تذکرہ کیا ہے جن پر مشہور مستشرق الفریڈ گیوم نکلسن اور منکرینِ حدیث نے اعتراضات کیے ہیں اور اعتراضات کی نوعیت کچھ یوں بنتی ہے کہ ذخیرہ احادیث میں باہم متعارض روایات بھی موجود ہیں مثلاً زانی کے جنت میں داخل ہونے کی روایت، ختم نبوت اور مسیح علیہ السلام کی آمد ثانی روایات، کھڑے ہوکر پیشاب کرنے کی اجازت اور ممانعت کی روایات، کھڑے ہوکر پانی پینے کے جواز اور ممانعت کی روایات، کتا رکھنے کے جواز اور عدمِ جواز کی روایات، واقعہ معراج سے متعلق متعارض روایات، مصنف نے یہاں بھی جمع وتطبیق اور اسلامی شریعت کے اصولوں کی روشنی میں جواب دیا ہے اور ان اعتراضات کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے، مثال کے طور پر کھڑے ہوکر پیشاب کرنے کی اجازت اور ممانعت کی روایات کے ذیل میں لکھتے ہیں: اسلامی شریعت کا اصول یہ ہے کہ ضرورت اور مجبوری کی صورت میں اصل حکم کو ترک کیا جاسکتا ہے، لیکن جیسے ہی وہ عذر اور مجبوری ختم ہوگی اصل حکم پر ہی عمل کیا

جائے گا(ص۱۹۶)

فصل دوم قرآن مجید کے ساتھ متعارض روایات پر اعتراضات واشکالات کا جائزہ لیا گیا ہے ،مصنف عورتوں سے جماع فی الدبر کی روایت پر بحث کے خاتمے پر لکھتے ہیں: المختصر ابن عمر کے ایک شاذ قول اور مرجوح قول کے مقابلے میں جمہور مسلمانوں کے طرزِ عمل اور رسول اللہ کی متعدد احادیث کو ، جن میں جماع فی الدبر پر سخت وعیدیں سنائی گئیں ہیں ،نظر انداز کرنا افسوسناک ہے (ص؟۲۱) حضرت مسیح علیہ السلام کی آمد ثانی کی روایات کے موضوع پر جاوید احمد غامدی کے تین دلائل پیش کیے گئے ہیں اور مصنف توضیحات میں لکھتے ہیں :غور کیا جائے تو مذکورہ تینوں دلائل کی بنیادی نوعیت ایک ہی ہے ،یعنی قرآن مجید کے سیدنا مسیح علیہ السلام کے نزول ثانی کا ذکر نہ کرنے سے یہ اخذ کیا گیا ہے کہ ان کے دوبارہ نزول کی روایات مستند نہیں (ص۲۱۸) مصنف بحث کا اختتام ان الفاظ میں کرتے ہیں : پھر مذکورہ اشکالات میں اگر علمی طور پر کچھ وزن ہو تو بھی زیادہ سے زیادہ اشکال درجہ رکھتے ہیں ۔ایسی صورت میں آدمی یہ تو کہہ سکتا ہے کہ ان مقامات پر حضرت مسیح علیہ السلام کی دوبارہ آمد کا ذکر نہ ہونا ذہن کو کھٹکتا ہے ،لیکن اس بنیاد پر ان روایات کو ہی سرے سے رد کر دینے کا کوئی جواز نہیں جو متعدد سندوں سے نبی سے ثابت ہیں (ص۲۲۱)

باب چہارم کا عنوان سیاست وقضا سے متعلق روایات ہے، یہ باب دوفصول پر مشتمل ہے ۔فصل اول میں منکرین ومعاندین کے خلاف اقدامات کی روایات پر بحث کی گئی ہے ۔اس فصل میں بنیادی طور پر دو موضوعات پر بحث کی گئی ہے ہر حال میں لوگوں سے جنگ کرنے کی روایت اور سرداروں کے قتل کی بابت میں مستشرقین نے بعض روایات کی روشنی میں اسلام کے تصورِ جہاد کو دہشت گردی سے منسوب کر دیا ہے حالانکہ جہاد دو صورتوں سے مشروع ہے ایک یہ کہ جہاد صرف دفاع اور دشمنان اسلام کے ظلم وجور کے خاتمہ کے لیے اور دوسرا یہ کہ قانونِ اتمام حجت جو کہ عہدِ رسالت ہی سے متعلق ہے ۔نصوص میں دو قسم کی آیات آئی ہیں ،مصنف لکھتا ہے : جہاد صرف دفاع اور دشمنانِ اسلام کے ظلم وجبر کے خاتمہ کے لیے مشروع ہے (ص۲۳۰) جہاں تک دوسرے نصوص کا تعلق ہے جن میں اسلام قبول نہ کرنے والے کفار کے ساتھ قتال کرنے اور انہیں مغلوب کرنے کا حکم ہے تو ان کا تعلق اللہ تعالیٰ کے قانونِ اتمام حجت سے ہے (ص۲۳۲) مصنف لکھتا ہے : فقہاء نے احناف اس بات کی تصریح کرتے ہیں کہ مشرکین کے ساتھ کیے جانے والے قتال کی نوعیت ،قتال کے عمومی احکام سے مختلف ہے، چنانچہ وہ اس کی فتنہ وفساد یا شرک کو نہیں بلکہ اس بات کو قرار دیتے ہیں کہ انہوں نے اتمام حجت کے باوجود پیغمبر ﷺ کی تکذیب کی تھی (ص۲۳۴)، یہودی سرداروں کے قتل (کعب بن الاشرف کے خلاف گوریلا کاروائی، ابو رافع کے خلاف گوریلا

کاروائی، قبیلہ عکل وعرینہ کے باغیوں کے قتل کی روایت) کی بابت جو روایات آئی ہیں، اگر ان کو دیکھا جائے تو ان کے جرائم کے پیش نظر ایک ریاست کو اسی طرح ہی کے فیصلے کرنے چاہیں اور ان کے خفیہ قتل میں بھی بڑی حکمت پوشیدہ تھی کیونکہ پوری قوم کو جنگ میں شریک کر لینا مناسب معلوم نہیں ہوتا اسی لیے ان کو خفیہ ہی قتل کر دیا گیا۔

فصل دوم سزائے رجم کی روایات پر مشتمل ہے، اس فصل میں مصنف نے رجم کی سزا کے بارے میں مختلف اشکالات کے بارے میں جواب دینے کوشش کی ہے، یہودی جوڑے کے رجم کی روایات، عہدِ رسالت میں واقعات رجم کی روایات، ماعز اسلمی کے رجم کا واقعہ، غامدیہ کے رجم کا واقعہ، مزدور کے رجم کا واقعہ، ایک گمنام آدمی کے رجم کا واقعہ، ان تمام موضوعات پر بحث کو سمیٹتے ہوئے مصنف لکھتا ہے: واقعاتِ رجم کے اس تاریخی اور تحقیقی جائزہ سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ رجم کے ان تمام واقعات کا تعلق سورۃ نور کے نزول کے بعد کے دور سے ہے، اس لیے یہ روایات قطعاً منسوخ نہیں ہیں اور ان کو سورۃ نور کے نزول سے پہلے دور سے متعلق قرار دینے کا دعویٰ تاریخی طور پر غلط ہے۔ پھر عہدِ رسالت کے بعد خلفائے راشدین کے عمل اور جمہور مسلمانوں کے مسلسل تعامل نے بھی رجم کے شرعی حد ہونے میں کوئی اشکال باقی نہیں رہنے دیا۔ الغرض رجم کے انکار کے لیے جس طرح یہ دعویٰ غلط ہے کہ نبی ﷺ نے یہودی جوڑے کو تورات کے حکم کے مطابق رجم کروایا تھا، اسی طرح یہ کہنا کہ رجم کی روایات سورۃ نور کے احکام سے پہلے کی ہیں، ایک ایسا دعویٰ ہے جس کی کوئی علمی بنیاد نہیں ہے (ص ۲۹۰) اس فصل میں مصنف نے اس موضوع پر لکھی گئی تمام کتب کا تذکرہ کیا ہے اور روایتی نکتہ نظر کا بھرپور انداز سے دفاع کیا ہے۔

بابِ پنجم انبیاء علیہم السلام کی سیرت سے متعلق روایات پر تنقید اور اعتراضات کا جواب پر مبنی ہے۔ یہ بات تین فصول پر مشتمل ہے،

فصل اول انبیائے سابقین کی سیرت سے متعلق روایات، اس میں کل نو انبیاء سابقین سے متعلق کل نو روایات کا انتخاب کیا گیا ہے، جن میں تین کا تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہے اور ایک کا تعلق حضرت یوسف علیہ السلام، اور چار روایات کا تعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہے اور ایک روایت کا تعلق حضرت سلیمان علیہ السلام سے تعلق رکھتی ہے۔ ان روایات پر اعتراضات اور اشکالات منکرین حدیث یا بعض مسلمان اہل علم نے پیش کیے ہیں؛ حضرت ابراہیم کے کذبات ثلاثہ کی روایت پر پیش کیے گئے اعتراضات کو کذب اور تعریض پر مفصل بحث کر کے دور کر دیا گیا مصنف لکھتے ہیں: اس ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ زیرِ مطالعہ حدیث میں لفظ کذب کو تعریض پر اس طرح محمول کرنا ایک بالکل صحیح اور معقول توجیہ ہے۔ اسی طرح سقیم سے مراد یہاں روحانی مریض ہے، جبکہ اختی کا مطلب دینی بہن ہے، گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعریض اور توریہ کے ذریعہ اپنے مخاطبین کو ظاہری معانی کی

طرف متوجہ کردیا، جبکہ خود اس سے دوسرے معنی مراد لیا (ص۳۰۹) حضرت ابراہیم کے ختنے والی روایت میں منکرین حدیث کو عریانیت نظر آرہی ہے، مصنف لکھتا ہے: ختنہ کے وقت حضرت ابراہیم بوڑھے نہیں تھے اور نہ ہی وہ کسی حجام کے پاس ختنہ کروانے کے لیے گئے، بلکہ یہ کام انہوں نے خود کیا تھا (ص۳۱۰) اس روایت پر بھی بڑا اعتراض کیا جاتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام لوگوں کے سامنے عریاں ہوگئے، مصنف نے روایت کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرتے ہوئے علامہ ابن حزم کی اس توجیہ سے بحث کو سمیٹا ہے: حدیث میں یہ نہیں ہے کہ بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کی شرم گاہ دیکھ لی تھی جو کہ ستر میں آتی تھی۔ انہوں نے ان کی بس ایسی حالت دیکھی جس سے انہیں یقین ہوگیا کہ وہ ان کے متعلق خصیوں کے پھولے ہونے کی جو بات کہتے تھے، موسیٰ علیہ السلام اس سے بری ہیں اور یہ بات تو ہر دیکھنے والے کو کسی شک کے بغیر یوں معلوم ہوسکتی ہے کہ وہ شرم گاہ کو نہ دیکھے، لیکن (کپڑوں کے اوپر سے) دونوں رانوں کے مابین جگہ کو خالی دیکھ کر سمجھ لے (کہ خصیوں کی بیماری نہیں ہے) (ص۳۳۲۔۳۳۳) حضرت سلیمان علیہ السلام کی سو بیویوں سے مقاربت سے متعلق روایت پر تین اعتراضات وارد ہوئے ہیں: بیویوں کی تعداد، ایک ہی رات میں مقاربت، تلقین کے باوجود ان شاء اللہ نہ کہنا، بیویوں کی تعداد کے بارے میں اعتراض کو بائبل کے حوالے سے واضح کیا گیا، ایک ہی رات میں مقاربت کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں: یہ حدیث بھی ایسے معجزانہ اور خارق عادت واقعات میں سے ہے (ص۳۴۴)

فصل دوم میں رسول اللہ کی سیرت سے متعلق چار روایات کا انتخاب کیا گیا ہے، رسول اللہ پر جادو کی روایات، عمر عائشہؓ سے متعلق، ابنۃ الجون سے متعلق روایت، ماریہ مصریہ پر تہمتِ زنا کی روایت، پہلے دو موضوعات کے بارے میں ہمارے دینی لٹریچر میں بہت کچھ مواد موجود ہے اور مصنف نے کمالِ مہارت سے سارے لٹریچر کو کھنگھال کر ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ جادو کے متعلق مصنف لکھتے ہیں: جب بھول چوک انبیاء اور نبی کریم کے لیے ثابت ہے تو جو اعتراض جادو کے متعلق کیا جاتا ہے وہ بھول کے متعلق بھی کیا جاسکتا ہے، اس لیے درست بات یہی ہے کہ آپ کو بھی عام انسانوں کی طرح زندگی کی مشکلات اور عوارض کا سامنا کرنا پڑا، تاہم وحی اور دین کی دعوت میں آپ مکمل طور پر اللہ کی حفاظت میں تھے، معصوم اور محفوظ عن الخطا تھے (ص۳۵۸) اور مستشرقین نے پیغمبر کی شخصیت کو داغدار ثابت کرنے کے لیے عمر عائشہؓ سے متعلق اتنا واویلہ مچایا کہ مسلمان بھی اسی بہکاوے میں آگئے اور مصنف نے مستشرقین اور مسلمان معترضین کے اعتراض کو سامنے رکھ کر ساری بحث کی۔ اور یہ ثابت کیا کہ رسول اللہ ﷺ کے نکاحوں کی حکمت کو سامنے رکھے بغیر ان اعتراضات کو صاف نہیں کیا جاسکتا اور بحث کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا: جس طرح حضرت خدیجہؓ کے بعد رسول اکرم ﷺ کی تمام شادیوں کے اسباب خالصتاً سماجی وسیاسی او

ردینی نوعیت کے تھے جس کا اعتراف غیر جانبدار مغربی سیرت نگاروں نے بھی کیا ہے، بالکل اسی طرح حضرت عائشہؓ سے آپ کے نکاح کی سب سے بڑی حکمت علمی اور دینی تھی۔ رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد حضرت عائشہؓ کی علمی خدمات اس کی زندہ جاوید شہادت ہیں۔ آپ سے بائیس سو (۲۲۰۰) احادیث مروی ہیں اور آپ نے اپنی خداداد علمی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ہزاروں لاینحل مسائل کی گتھیاں سلجھائیں۔ اکابر صحابہ کو مختلف دینی مسائل میں آپ کی طرف بار بار رجوع آپ کی فقہی بصیرت کا واضح اعتراف ہے (ص ۳۷۳)

فصل سوم میں رسول اللہ ﷺ کی نجی زندگی سے متعلق پانچ روایات کا انتخاب کیا گیا ہے، فصل کے آغاز میں ازواج مطہرات کا مقام ومرتبہ اور دینی ذمہ داریوں کے حوالے سے قرآن وحدیث کی روشنی میں ان کے مقام ومرتبہ اور دینی ذمہ داریوں کو متعین کیا گیا ہے تاکہ یہ واضح ہوسکے کہ ازواجِ مطہرات نے کن دینی ضرورتوں کی بناء پر نجی معاملات بیان کیے۔ نبی ﷺ کی حالتِ حیض میں ازواج مطہراتؓ سے مباشرت کی روایات پر اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے مصنف لکھتا ہے: مباشرت کا اصل مفہوم محض بدن کو چھونا ہے جبکہ مجامعت کے لیے یہ لفظ بطورِ کنایہ استعمال ہوتا ہے (ص ۳۹۶) ازواجِ مطہرات سے وجوبِ غسل کے متعلق سوال کی روایت کے بارے میں یہ اعتراض کہ اس نوعیت کا سوال کیوں اٹھایا گیا؟ مصنف لکھتا ہے: ان تمام روایات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وجوبِ مسائل کا مسئلہ کس قدر الجھ چکا تھا صحابہ کرام کے درمیان پائے جانے والے اس شدید اختلاف کے تناظر میں ہی صحابہ کرام کو امہات المؤمنین سے یہ سوال کے پوچھنے کی جسارت کرنی پڑی (ص ۴۰۱)۔ حضرت عائشہؓ کے عملاً غسل کر کے دکھانے کی روایت کے بارے میں مصنف معترضین کو جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں: حدیث کے سیاق وسباق پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ میں اختلاف یہ نہ تھا کہ غسل کا طریقہ کیا ہے بلکہ بحث یہ چھڑ گئی تھی کہ غسل کے لیے کتنا پانی کافی ہوسکتا ہے۔ بعض لوگوں کو یہ روایت پہنچی تھی کہ آپ ﷺ ایک صاع پانی سے غسل کرلیا کرتے تھے۔ اتنے پانی کو غسل کے لیے ناکافی سمجھا گیا تو حضرت عائشہؓ نے بیچ میں پردہ لٹکا کر ان کو عملاً غسل کر کے دکھایا اور یوں دو باتیں سمجھائیں۔ ایک یہ کہ غسل جنابت کے لیے صرف جسم پر پانی بہانا کافی ہے اور دوسرا یہ کہ اس مقصد کے لیے ایک صاع پانی کفایت کرجاتا ہے (ص ۴۰۳)

باب ششم عقل عام اور مشاہدہ سے ظاہری تعارض پر مبنی روایات کے نام سے ہے اور یہ تین فصول پر مشتمل ہے۔ پہلی فصل مشاہدہ تجربہ کے خلاف روایات پر مبنی ہے اور اس میں زیادہ تر روایات کا تعلق سائنسی نوعیت کی معلومات یا عام مشاہدہ پر مبنی ہے۔ مثال کے طور پر مصنف گرمی کی شدت کو جہنم کا سانس قرار دینے کی روایت کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے حوالے سے لکھتے ہیں: ہر فن کی خاص اصطلاحیں اور ہر شعبہ علم کی ایک

مخصوص بولی اور زبان ہوتی ہے اور ہر علم وفن اپنے سارے مفہوم انہی مخصوص اصطلاحوں اور بولیوں میں ادا کرتا ہے جو دوسروں کو ممکن ہے بالکل اجنبی ،نامانوس اور عجیب معلوم ہوں ۔حقیقتوں میں فرق کچھ بھی نہ ہوگا لیکن عبارتیں ہر فن کی دوسرے سے بالکل ہی یگانہ بلکہ متضاد معلوم ہوں گی (ص۴۲۱) سورج کے عرش کے نیچے سجدہ کرنے کی روایت کے بارے میں مصنف نے منکرینِ حدیث کے اعتراض کو ان الفاظ میں رقم کیا ہے : منکرینِ حدیث نے اس حدیث پر حدیث کا علم الافلاک اور معلوماتِ عامہ جیسے طنزیہ عنوانات چسپاں کرکے اس کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے (ص۴۲۶)اور اس روایت پر اعتراض کا جواب طے کرتے ہوئے مصنف لکھتا ہے : اس حدیث مبارک میں سورج کے سجدہ کرنے کو نماز میں سجدہ کرنے کی مثل سمجھ لینا درست نہیں ۔حدیث میں مذہب کی مخصوص اصطلاح میں صرف یہ مفہوم بیان ہوا ہے کہ سورج ہو یا زمین ، وہ ہر لحہ حکمِ الٰہی کے تابع ہیں اسی طرح سورج کا طلوع وغروب بھی حکمِ الٰہی کے تابع ہے (ص۴۲۷) بندروں کے رجم کی روایت کے ضمن میں لکھا گیا : اس روایت کا انکار دیگر روایات کے مثل نہیں کیونکہ یہ واقعہ رسول اللہ کی طرف منسوب نہیں اس کے راوی حضرت عمرو بن میمون ہیں جو صرف ایک تابعی ہیں صحابی بھی نہیں ۔ وہ اپنا ایک چشم دید واقعہ بیان کررہے ہیں پھر اس واقعے سے کسی عقیدے کا بیان بھی مقصود نہیں اس لیے نفسِ واقعہ کے انکار کی بناء پر کسی شخص کو انکارِ حدیث کا مرتکب قرار نہیں دیا جاسکتا (ص۴۴۶) آگے لکھتے ہیں : کسی بھی روایت پر محض عقل کی بنیاد پر تنقید کرنا ایک خطرناک رجحان ہے کیونکہ اگر عقل کو ہی حتمی کسوٹی قرار دیا جائے تو پھر اس کی زد قرآن مجید پر بھی پڑتی ہے مثال کے طور پر قرآن میں ایک کوے کا ایک دوسرے کوے کو زمین میں دفن کرنے کا واقعہ موجود ہے (ص۴۴۷)

فصل دوم عقل وقیاس کے منافی روایات، اس فصل میں تین روایات کا انتخاب کیا گیا ہے ۔واقعہ معراج میں نماز کی فرضیت کی روایت کے بارے میں منکرینِ حدیث کے اعتراض کا جواب مصنف دیگر دلائل کے ساتھ اس انداز سے بھی دیتے ہیں : اگر طلب ہدایت کا جذبہ لیے ہوئے اس حدیث کا مطالعہ کیا جائے تو اس حدیث میں تخفیف کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت کا منظر نظر آتا ہے لیکن اگر حدیث کا انکار اور استہزاء ہی پیشِ نظر ہو تو پھر وہ سارے اعتراضات اور اشکالات پیدا ہوتے ہیں جن کا سطورِ بالا میں ذکر کیا گیا ہے ۔اگر ہر جگہ تشکیک کی یہی عینک آنکھوں پر لگی رہی تو پھر اس ایک حدیث پر ہی کیا موقوف ہے اس کے علاوہ بھی بے شمار احادیث بلکہ آیات بھی ملیں گی جہاں اگر اسی انداز میں طبع آزمائی کی جائے تو بیسیوں اعتراضات پیدا کیے جاسکتے ہیں (ص۴۶۰)اس جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے پیشِ نظر عام مسلمان ہے ورنہ مستشرقین یا منکرین کو جواب دینے کے لیے اس قسم کی ایمانی طاقت سے اپیل نہیں کیا جاسکتا۔ گناہ کی حوصلہ افزائی کی روایت کے بارے میں لکھتے ہیں : گناہ

انسانی فطرت کا لازمی تقاضا ہے اور اللہ کا مطلوب انسان وہی ہے جو اس فطری تقاضے کی بناء پر ہر لحہ اللہ تعالیٰ سے معافی کا طلب گار رہو کیونکہ توبہ واستغفار اللہ کے ہاں بڑی نیکی ہے (۴۷۰)

فصل سوم ماضی اور مستقبل کی خبروں پر مشتمل روایات، اس فصل میں تین موضوعات زیر بحث لائے گئے ہیں، مسجدِ حرام اور مسجدِ اقصیٰ کی تعمیر کی روایت، سو سال کے بعد دنیا کے خاتمے کی پیش گوئی کی روایت، قیصر وکسریٰ کی ہلاکت کی پیش گوئی کی روایت، سو سال کے بعد دنیا کے خاتمے کی پیش گوئی کی روایت کی توضیح کرتے ہوئے مصنف لکھتا ہے: اس حدیث کے مفہوم میں جو اشکال نظر آتا ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس حدیث کے دیگر شواہد وتوابع کو دیکھنے کی زحمت نہیں کی گئی یہ حدیث بعض دیگر اسناد سے بھی مروی ہے ان تمام احادیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں راوی سے وہی غلطی سرزد ہوئی ہے جو عموماً زبانی روایت میں سرزد ہو جاتی ہے یعنی بعض اوقات راوی پوری بات نہیں سن پاتا یا وہ حدیث کا کوئی حصہ بیان کرنا بھول جاتا ہے جس کی وجہ سے حدیث کا مفہوم بالکل تبدیل ہو کر رہ جاتا ہے۔ نبی کے بیان کا مطلب یہ تھا کہ آج جو لوگ کائنات ارضی پر بقید حیات ہیں جب یہ صدی ختم ہوگی تو ان میں سے کوئی بھی زندہ نہ ہوگا۔ بعض لوگوں نے ان الفاظ کی طرف توجہ نہ دی اور یہ سمجھا کہ دنیا سو سال بعد ختم ہو جائے گی (ص ۴۸۰۔۴۸۱)

کتاب کے مطالعہ کے آغاز پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جدید ذہن سے کیا مراد ہے؟ پوری کتاب کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ مصنف کے نزدیک جدید ذہن سے مراد مستشرقین اور منکرین کے اٹھائے گئے اعتراضات کے جواب دینے کے لیے یہ کتاب مرتب کی گئی ہے، مصنف نے اشکالات کو سامنے لانے کے لیے مستشرقین اور مسلمان منکرین حدیث اور بعض اہلِ تجدد اور اہلِ علم کے کام میں سے انتخاب کیا ہے اور انتخاب کے اس عمل کے بارے میں لکھتے ہیں: منکرین حدیث اور اہلِ تجدد نے صحاح ستہ کی جن روایات پر تنقید کی ہے ان میں سے بعض روایات کمزور ہیں اور محدثین ان کے ضعف کو پہلے واضح کر چکے ہیں ایسی روایات چونکہ نا قابل استدلال ہیں اس لیے ہم نے ان سے تعرض نہیں کیا۔ تاہم منکرین حدیث اور اہلِ تجدد نے جن صحیح روایات پر تنقید کی ہے زیرِ نظر کتاب میں صرف انہی روایات پر اعتراضات واشکالات کا جائزہ لیا گیا ہے (۶۵ ۔ ۶۶) مصنف لکھتے ہیں: کتاب میں پچاس سے زائد موضوعات پر خالص تحقیقی اسلوب میں مستشرقین، منکرین حدیث اور اہلِ تجد کے اعتراضات پر بحث کی گئی ہے وہ روایات جو اس مقالہ میں زیرِ بحث آئی ہیں ان کی کل تعداد سو کے لگ بھگ ہے، ان میں سے بیشتر روایات متفق علیہ ہیں جبکہ بعض روایات متفق علیہ تو نہیں لیکن صحاح ستہ کی مختلف کتابوں میں منقول ہیں (ص ۶۶)

کتاب کے نصف اول میں مستشرقین اور منکرین کے اعتراضات کے جوابات دیے گئے ہیں اور نصف آخر میں تقریباً منکرین حدیث کے جوابات وارد کیے گئے ہیں جن احادیث مبارکہ پر اعتراضات یا اشکالات وارد کیے گئے ہیں مصنف ان کو متن اور ترجمہ سمیت نقل کرتے ہیں، پھر بعض اوقات اعتراضات کے مختلف پہلو درج کر دیتے ہیں یا یہ لکھ دیتے ہیں کہ فلاں فلاں نے اس روایت کو ہدفِ تنقید بنایا ہے یا سرے سے لکھتے ہی نہیں ہیں کہ ان روایات پر کس نے تنقید کی ہے۔

کسی موضوع پر اعتراض درج کرنے کے بعد مصنف جواب دینے سے پہلے اس موضوع پر کیے گئے کام کا حاشیہ میں تذکرہ کرتے ہیں، صرف مصنف کا نام، کتاب کا نام، ناشر وغیرہ کی تفصیل کا تذکرہ کرتے ہیں۔ جوابات دینے کے لیے توضیحات کے عنوان کا نام انتخاب کیا گیا ہے، حوالہ دیتے وقت مصنف نے قرآنی آیت کا حوالہ حاشیہ میں لکھنے کی بجائے آیت ساتھ لکھ دی ہے۔

کتاب پر درج مبسوط اور جامع مقدمہ مصنف کی محنت اور عرق ریزی کی غمازی کر رہا ہے، متن حدیث پر اعتراضات پر مبحث ہمارے دینی لٹریچر میں بکھرے پڑے ہیں مثلاً حدیث کی کتابت وممانعت کا موضوع، سبعہ احرف، مسیح علیہ السلام کی آمد ثانی کی روایت سزائے رجم کی روایات، ابراہیم علیہ السلام کے کذبات ثلاثہ، نبی ﷺ کی نجی زندگی سے متعلق روایات وغیرہ، مگر مصنف نے کمالِ مہارت سے ان تمام موضوعات کو ایک لڑی میں پرو کر قارئین کے سامنے پیش کر دیا ہے۔

مصنف کی ژرف نگاہی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے ایک روایت پر دو مستشرقین کے موقف کو کمالِ مہارت سے الگ الگ باب میں بھی ذکر کر دیا، وضع حدیث کے ضمن میں حضرت ابوھریرہؓ کی روایت کتے کے بارے میں، پھر گولڈ زیہر کے نتائج پر بحث، اور پھر کتا رکھنے کے بارے میں حکم وممانعت کی بحث، نکلسن کی تنقید پر توضیحات بیان کرنا، لیکن تخریج کے ضمن میں پہلی بار تذکرہ کرتے ہوئے مصنف نے بخاری کا تذکرہ نہیں کیا لیکن جب وہی روایت دوسری بار لائے تو بخاری کا تذکرہ موجود ہے (ص۹۲، ۲۰۰)

جدید ذہن کے اشکالات دور کرنے کے لیے لکھی گئی یہ کتاب بیسویں صدی کے اوائل یا وسط تک کے معترضین کے دلائل کو رد کیا گیا ہے، حالانکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ عہدِ حاضر کے مستشرقین یا ان کے خوشہ چیں حدیث کے جس پہلو پر نقد کر رہے ہیں، اس کا جائزہ شامل کیا جاتا، ڈاکٹر محمد اکرم ورک صاحب نے مقدمہ کے آخر میں اپنے موضوع سے قریب تر ماضی قریب میں ہونے والے کام کی فہرست پیش کی لیکن اس فہرست میں مستشرقین کے کام کا بالکل تذکرہ نہیں کیا، اس کی دو وجوہات ہوسکتی ہیں یا تو ان کی نظر میں عہدِ حاضر کے مستشرقین متنِ حدیث

پر اپنے پیشروؤں کے کام پر کام چلا رہے ہیں یعنی مکھی پر مکھی مارے جا رہے ہیں یا عہدِ حاضر کے مستشرقین کے کام پر ان کی نظر ہی نہیں۔ دوسرے پہلو کے بارے میں ان کے متعلق ایسی بات کہنا مناسب معلوم نہیں ہوتی۔

پروف ریڈنگ کا کام انتہائی محنت طلب اور عرق ریزی کا متقاضی ہوتا ہے اور الشریعہ اکادمی نے اس پہلو پر خاص توجہ دی ہے، بعض جگہوں پر حوالہ اسی صفحے کے حاشیہ میں لکھنے کی بجائے اگلے صفحے کے حاشیہ میں لکھ دیے گئے۔ مثلاً ص ۲۱۳، ۲۲۹، ۳۱۸، ۳۴۹ وغیرہ، کہیں حوالہ درج نہیں مثلاً ۱۸۰، اور ص ۲۱۴ پر اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی، آیت کو لکھنا ضروری ہے کیونکہ اس کے ساتھ روایت موجود ہے جس سے ابہام پیدا ہو رہا ہے، ص ۲۱۵ پر خزیمہ بن ثابت الخطمی کی روایت کے متن میں کمپوزر کی غلطی عیاں ہے اور اس روایت کے ترجمہ کو بھی دیکھ لیا جائے، ص ۳۶۷ پر حوالہ مکمل درج ہے لیکن مصنف کا نام نہیں لکھا گیا، حالانکہ مصادر ومراجع میں درج ہے، اور اسی طرح اس کتاب کی عبارت کا بھی پتہ نہیں لگ رہا ہے کہ یہ اقتباس کہاں سے شروع ہوا یا مصنف کا تبصرہ ہے یا اصل کتاب کے مصنف کی عبارت کا ترجمہ ہے۔

اس لحاظ سے کتاب کو کامیاب کہا جاسکتا ہے کہ ایک ہی جگہ پر تقریباً دو صدیوں میں ہونے والی حدیث پر اعتراضات کی بحث یکجا مل جاتی ہے۔ اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ کتاب الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کی خوبصورت پیشکش ہے۔ ایسی کتابوں کی طباعت عہدِ حاضر کی اشد ضرورت ہے۔ کتاب کے فلیپ پر میاں انعام الرحمٰن لکھتے ہیں: عصرِ حاضر میں متونِ حدیث پر وارد ہونے اشکالات کو دور کرنے کے لیے تحقیقی وتجزیاتی مطالعات پروان چڑھے ہیں۔ اگرچہ یہ مطالعات مسلم تہذیب کے باطن سے نہیں پھوٹے، بلکہ ایک خارجی یورش کی مزاحمت میں سامنے آئے ہیں، لیکن یہ ایک واضح پیغام لیے ہوئے ہیں کہ وہ وقت اب زیادہ دور نہیں جب مسلم تہذیب اپنے باطن میں پوشیدہ امکانات بغیر کسی مزاحمتی رنگ کے جدید ذہن کے سامنے پیش کرے گی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆